ڈاکٹر فرید حسینی
اسلام آباد ماڈل کالج فار بوائز، آئی ٹین ون، اسلام آباد
ڈاکٹر طاہر نواز
اسسٹنٹ پروفیسر (جز وقتی)، شعبہ اُردو
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

انتظار حسین کا فن اور ملفوظاتِ صوفیاء

Intizar Hussain is a prominent fiction writer in the context of post-colonialism studies. Most of the critic and his contemporary writers said that he always portrayed the past and glorified the Indian civilization. However, this is not the only truth. Intizar's stories have various aspects and Multi-dimensional shades. Sufism (Saints) influenced a lot on the fiction of Intizar Hussain. In this article efforts have been made to point out the relation between his art and Sufis sayings.

انسان تخلیق کائنات کا مرکزی نقطہ ہے۔ اس کی بناوٹ میں خالق نے اس سے قبل پیدا کی گئی دو مخلوقات ملائک و وحوش کے خواص بھی رکھے۔ پھر ارادہ و عقل دے کر مذکورہ دونوں مخلوقات سے ممتاز و ممیّز کر دیا۔ ابلیس کے شیطان بننے کے بعد آدم جب زمی پر اترے تو ان کے پاس روحانی و جسمانی دونوں طاقتیں موجود تھیں۔ جسم و روح کا مجموعہ بشر اب کامل آزادی کا نمونہ تھا۔ شیطان اور رحمان کے راستوں میں سے اپنی مرضی کا راستہ چن سکتا تھا۔ شیطان نے دنیا کی ہر مادی چیز کو انسان کے سامنے خوش نما بنا کر پیش کرنا شروع کیا اور اس چیز کے ضرر رساں پہلو کو قصداً اس سے پوشیدہ رکھا۔ رحمان نے ابوالبشر جناب آدمؑ کو علم وحی عطا کر کے انسانوں کو اشیاء کے ظاہر کے علاوہ اس کے باطن سے بھی آگاہ کیا اور یہ سلسلہ ختمی مرتبت ﷺ تک برابر چلتا رہا۔ اسی دوران نبیوں اور رسولوں کے علمی ورثے کو علماء و صوفیاء نے آگے بڑھایا۔ مادیت اور روحانیت میں سے ثانی الذکر صوفیاء کے نزدیک انسان کی سربلندی کا نسخہ ہے۔

> ''تصوف کی رو سے روح کو ریاضت کے ذریعے ہی جسم سے نجات کا راستہ ملتا ہے۔ اس لیے اہل تصوف ریاضت کے ذیعے جسم کو کندن بناتے ہیں۔ جب سالک ریاضت کے ذریعے کندن بن جاتا ہے تب آب و گل کا مرکب یہ بشر، زمین و فضا سے بلند کوئی اور جہان تلاش کرنے کے لیے پرواز کرتا ہے۔ جو کہ حیات کاملہ کا مقام ہے۔''[1]

تصوف کو ادب میں ہر زبان میں برتا گیا خصوصاً مشرقی زبانوں کے شعر و ادب میں اس کی مثالیں وافر مقدار میں موجود ہیں، رومی، خواجہ درد تو رہے ایک طرف غالب جیسا بادہ خوار بھی مسائل تصوف کو شعری قالب میں ڈھالتا رہا۔ فکشن کا آغاز اگر عہد نامہ عتیق سے مان لیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ قرآن نے انھی پرانے قصوں کو زیادہ ایمائیت کے ساتھ پیش کیا۔ ہندوستانی، ایرانی اور عربی کہانی کی روایت میں اس کا خاص التزام موجود ہے۔

انتظار حسین کی فنی زندگی میں تہذیب و تاریخ کو بہت اہمیت رہی ہے۔ تہذیب ہی فرد کی قوت اور معاشرہ کی تنظیم کی ضامن ہوتی ہے۔ فرد کی ذات گویا تہذیب سے اپنا ثبات کرتی ہے۔ جب کوئی شخص ضعف کا شکار ہو تو تہذیب زوال آمادہ ہونے کا خدشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وجود کی ٹوٹ پھوٹ کا تجزیہ انتظار حسین نے اپنی کہانیوں میں کیا تو تصوف سے مدد لی۔ صوفیائے کرام کی ملفوظات سے ان کے فن میں نکھار پیدا ہوا۔ اخلاقی زوال کو قومی لاشعور سے جوڑ کر اجتماعی شعور کو جگانے کی سعی کی گئی ہے۔

عمومی طور پر روایتی ناقدین نے انتظار حسین کے چند افسانوں کو ہی ملفوظاتِ صوفیاء سے جورا ہے مگر ایسا نہیں ہے۔ ان کے ناولوں اور افسانوں میں کئی جگہوں پر تصوف کی چاشنی موجود ہے۔

ناول تذکرہ (نیا گھر) میں حکایتی اسلوب جوبن پر نظر آتا ہے جب آباؤ اجداد کا تذکرہ بیان ہوا ہے۔ ایمائیت و علامت جبر کے دور میں فروغ پاتی رہی ہیں۔ ملوکیت کے ادوار میں جب شریعت کے پرچارک عتاب کا نشانہ بننے لگے تو تصوف کو فروغ ملا اور اسلام میں بنوامیہ اور بنوعباس اس کی واضح مثالیں ہیں۔ دونوں کا انجام تاریخ میں بعد میں آنے والوں کے لیے عبرت کا سامان لیے ہوئے ہے۔ چراغ علی جب اپنے ماضی اور حال کا تقابل کر رہا ہوتا ہے تو وہ اپنے تذکرہ میں بنوامیہ کے تکبر کو خاک آلود ہونے کا بیان کرتے ہیں۔ بلی بظاہر امن پسند اور ڈرپوک جانور ہے مگر اس نے طاقتور بادشاہ کے بریدہ سر میں سے زبان نکال کر چبالی:

> ''چراغ علی اس بیچ یہ کہتا ہے کہ بلی جتنی مسکین ہوتی ہے اتنی ہی سفاک بھی ہوتی ہے۔ جائے غور و نیز جائے عبرت کہ بنوامیہ کو جتنا گھمنڈ اپنی خلافت پر تھا اتنا ہی غرّہ اپنی خطابت پر تھا مگر گریۂ مسکین مروان الحمار کی زبان چبا کر ان کی خلافت اور خطابت دونوں کو چاٹ گئی۔''۲

یہاں تصوف کی رو سے عبرت ناک انجام اس بات کا متقاضی ہے کہ لوگ اس پر غور و فکر کریں۔ گھمنڈ اور تکبر چراغ علی کے زمانے میں جتنا موجود تھا اس سے بڑھ کر ناول نگار کے عہد میں فروغ پا رہا تھا لہذا مذکورہ ٹکڑے کی معنویت وطن عزیز کے لیے زیادہ اہم ہے۔

اردو ادب میں انتظار حسین کے معاصرین میں بانو قدسیہ، اشفاق احمد کو یہ تخصیص حاصل ہے انھوں نے کہانیوں

میں صوفیانہ رنگ زیادہ برتا۔ جمیلہ ہاشمی نے ''دشت سوس'' میں روحانیت اور مادیت کی کشمکش کو تصوف کی رو سے پرکھا ہے۔ عقل اور عشق کی ستیزہ کاری میں عشق ہار کر بھی بازی مات نہیں ہونے دیتے۔ شریعت کی گواہی سے سزا کو حق بجانب کروا کے جب اس پر عملدرآمد کا وقت آیا تو.....کوڑے کی ہر ضرب انا الحق کہہ رہی تھی۔ خود حبشی آہ کرنے کی بجائے انا الحق کہہ رہا تھا۔۳

یہاں کوڑے کی ضرب اور حبشی کی آہ کی تفہیم اور تعبیر ملفوظات کی روشنی میں ہی ممکن ہے۔ حسین بن منصور حلاج صوفیانہ تعلیمات ونظریات کا استعارہ ہے۔ وہ موت وحیات کے فلسفے سے آگاہ تھے اسی لیے وہ سقراط کی طرح موت کو گلے لگانے پر تذبذب کا شکار نہ ہوئے۔

اقتلو نی یا ثقاتی
انا فی قتلی حیاتی
و مماتی فی حیاتی
و حیاتی فی مماتی

ترجمہ: اے میرے دوستو! مجھے قتل کر دو کہ میری موت ہی میری زندگی ہے۔

فتح محمد ملک لکھتے ہیں کہ فرانسیسی مستشرق لوئی ماسینیون نے جب منصور حلاج کی زندگی پر کتاب Passion لکھی (جس پر انھوں نے ستاون سال صرف کیے) تو علامہ اقبال ماسینیون سے ملنے پیرس گئے۔۴

علی ہجویری نے صفا کو ولایت کی منزل بتایا ہے اور اس کی نشانیاں ہیں اور تصوف صفا کی ایسی حکایت وتعبیر ہے جس میں شکوہ وشکایت نہ ہو۔۵

انتظار حسین کی تخلیقات میں نعرہ وتبلیغ بھی نہیں اور شکوہ وشکایت کا شائبہ بھی نہیں ملتا۔ کرداروں کے ذریعے اور کہیں مصنف کے ہمہ بین بیان میں کہیں صورت واقعہ کے وسیلے سے معاشرتی ناہمواریاں اور دنیاوی کجیاں سامنے آتی رہتی ہیں۔

ناول آگے سمندر ہے مہاجرین کے دکھڑوں کا بیان ہے۔ مرکزی کردار جواد اپنے جگری یار مجو بھائی کو دل کا حال سنانے کی بجائے ہسپانیہ کے مسلمانوں کے عبرت انگیز قصے سنانے لگتا ہے۔ بڑھیا کا گھر جب مسجد کے توسعی منصوبے کی نظر ہونے لگتا ہے تو گویا ہوتی ہے:

''اس پر ام رقیہ قدرے برہم ہوئی اور بولی اے منصفی کرنے والے تو نے یہ عجب سوال کیا کہ ابی عامر کا بیٹا میرے صحن کے ٹکڑے کی قیمت تو ادا کر دے گا مگر میرے شجر کی بھی کوئی قیمت لگائی جا سکتی ہے۔''۶

عبدالرحمٰن اوّل نے فتح کے بعد جو کھجور کا پودا اپنے صحن میں لگایا تھا اس کو بھی انتظار حسین نے ماضی سے ناطہ جوڑ کر رکھنے کا استعارہ قرار دیا ہے۔ طارق بن زیاد کی کشتیاں جلانا بے کار گیا اور یوں روایت سے رشتہ پھر استوار ہو گیا۔ اسی ناول میں سپین کے ایک صوفی کا حال بیان ہوا ہے جس کی ایک بلی بھی تھی جو شیخ سے ملاقات کے آنے والوں کا دروازے پر استقبال کرتی۔ نیک لوگوں سے بغل گیر ہوتی اور فاسقوں اور دنیاداروں پر غرّاتی اور پنجے مارتی۔ اہل ظاہر اور خرد کے پیروکاروں کے لیے مندرجہ بالا حکایت شاید نا قابل قبول ہو مگر صوفی کا تو مسلک ہی باطن کی گتھیاں سلجھانا ہے جو خلاف عقل لگتی ہیں:

''ایک موقع پر شیخ قطب الدین جالسیری کو کہ مجذوب خرباتی تھے لوگوں نے پادریوں کے مقابلے میں مباحثے کے لیے پیش کیا..... جس کو دعویٰ ہو میرے ساتھ آگ میں کود پڑے جو صحیح سلامت نکل آئے وہ حق پر ہے۔ آگ دہکا کر تیار کی۔ انھوں نے ایک پاپا (پادری) کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ ہاں بسم اللہ۔ پاپاؤں نے کہا یہ بات خلاف عقل ہے''۷

جواد جب کراچی سے ہنودستان یاترا کے لیے جاتا ہے تو وہ میرٹھ اپنے دوست (تحریک آزادی کے جانباز اور ہجرت نہ کرنے والے) خیرل بھائی سے ملنے جاتا ہے۔ خیر بھائی کی واحد ہم نشین ان کی صندلی رنگ کی بلی ہے۔ یہ بلی جواد کو دیکھ کر منہ موڑ لیتی ہے اور اندر چلی جاتی ہے۔ اب قاری کے لیے دعوت عام ہے کہ وہ شیخ کی اور خیرل بھائی کی بلی کا تقابل کرے۔ یہاں جواد اور خیرل بھائی کے درمیان کچھ بھی گلے شکوے نہیں ہوتے مگر بلی کے توسط سے جواد کی دنیاداری ہم پر ضرور عیاں ہو جاتی ہے۔

فکشن میں تصوف کو برتنا خاصا دشوار ہے اور قاری کے لیے اس کی تفہیم اور بھی کٹھن ہے کیوں کہ محض عقل کی کسوٹی پر پرکھنے سے فن پارہ اوپری تہ تو کھولتا ہے۔ مگر پورا نہیں کھلتا اس کے لیے عقل سے سوا کسی قوت کی ضرورت ہے۔ کیمیائے سعادت میں امام غزالی نے سفر کی دو اقسام بتائی ہیں۔ ظاہری اور باطنی۔ ظاہری میں بندہ کعبہ کے پاس جاتا ہے اور باطنی میں کعبہ بندے کے پاس آتا ہے۔۸

کعبہ کیسے بندے کے پاس آتا ہے اس کے لیے فریدالدین عطار کی منطق الطیر اور رابعہ بصری کی زندگی سے رجوع کرنا پڑے گا۔ جواد اپنی سابقہ منگیتر میمونہ سے جب ہندوستان میں ملتا ہے تو وہ جواد کی بے وفائی کا ذکر کرتی ہے۔ حتیٰ کہ اسے واپس پاکستان چلے جانے کا کہہ دیتی ہے۔ واپسی پر مجو بھائی اسے حقیقت حال سے آگاہ کرتا ہے۔ یار محبوب کے گلے شکوے، کوسنے ہی تو اس کے پیار کی نشانیاں ہیں۔ تمھیں وہاں مزید رہنا چاہیے تھا۔ یہاں ایک مرتبہ پھر امام غزالیؒ سے سند لیتے ہیں:

''حضرت شبلیؒ کو لوگوں نے دارالشفا میں رکھا (دیوانہ سمجھ کر پاگل خانے میں بند کر دیا) کچھ لوگ ان سے

ملنے آئے تو آپ نے پوچھا تم کون ہو؟ کہنے لگے ہم آپ کے دوست ہیں۔ پس حضرت شبلی انہیں پتھر مارنے لگے تو وہ بھاگے۔ آپ نے فرمایا تم دوستی کے دعوے میں جھوٹے ہو کیوں کہ واقعی اگر میرے دوست ہوتے تو میری بلا اور مصیبت پر صبر کرتے۔''۹

جواد کو مجو بھائی کی بات پسند آئی ہے وہ پچھتاتا ہے۔ کہ میمونہ مجھے دھتکار نہیں چمکار رہی تھی۔ میمونہ کو حضرت شبلیؒ سے نسبت دے دی جائے تو کہانی کے ابلاغ میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔

اپنے ایک افسانے ''نرالا جانور'' میں انتظار حسین نے مہابھارت سے تصوف کے چند پہلو اجاگر کیے ہیں۔ جنمی جئے اور ویاس جی کے درمیان مکالمے ''زرد کتا'' کے صوفی اور اس کے مرید سے گہری مماثلت رکھتے ہیں۔ ویاس جی کہتے ہیں ایک بیوپاری گھوڑا بیچنے آئے گا تم وہ نہ خریدنا مفت بھی دے تب بھی۔ جنمی جئے کہتا ہے اگر خریدلوں گا تو پھر کیا ہوگا۔ تو پھر اس پر سوار مت ہونا۔ ٹھیک ہے میں آپ کی آ گیا کا پالن کروں گا مگر اگر سوار ہو گیا تو؟ رشی جی بولے پھر وہ گھوڑا ہوا ہو جائے گا رکے گا نہیں۔ جنگل بیابان میں تجھے جا اتارے گا۔ جنمی بولا میں بہادر ہوں جنگل میرا کیا بگاڑ لے گا۔ شہر، اژدھا، بھوت، راکشس سب کو میں مار سکتا ہوں۔ ویاس جی نے کہا میرے بھولے۔ ان سب سے بڑھ کر ایک اور بلا بھی ہے۔ وہ کون بلا ہے؟ ناری۔ ناری؟ ہاں اس کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ پورے افسانے میں مکالمات باطنی حقائق سے پردہ اٹھاتے نظر آتے ہیں۔ عام زندگی میں بھی انتظار حسین صوفی ازم کے قریب نظر آتے ہیں:

''سامنے ایک میلا سا رومال بچھا ہے۔ اس پر بہت ساری ماچس کی خالی ڈبیاں رکھی ہیں..... بابا یہ کیا ہے؟ ناصر کاظمی منہ میں پان رکھتے رکھتے پوچھتا ہے۔ یہ خالی بستیاں ہیں۔ خالی اجڑی بستیاں۔ ناصر اداس ہو جاتا ہے۔''۱۰

ماچس کی ڈبیا کو بستی سے تشبیہ دینا فقیر اور مجذوب کے لیے تو جائز ہے مگر ناصر کاظمی کا اداس ہونا سمجھ سے بالاتر ہے۔ اور چراغوں کا دھواں میں انتظار حسین کا اس واقعے کو قلم بند کرنا اور بھی معانی خیز ہے۔ انتظار حسین نے جہاں جہاں جانوروں اور پرندوں کا ذکر کیا ہے وہاں بھی کہانی کے بھید تصوف ملفوظ ہیں۔ اسی لیے کبوتر کو انہوں نے پرندوں کا صوفی کہہ رکھا ہے۔ گلہری اور ہد ہد کو بالترتیب رام چندر جی اور حضرت سلیمان علیہ السلام سے نسبت بھی بلا وجہ نہیں دیتے۔

صوفیائے کرام کی تعلیمات کا بنیادی نکتہ لالچ، لوبھ اور حسد سے نفرت وار قربانی، محبت اور پیار کا پرچار ہے۔ آخری آدمی کا الیاسف انسان سے بندر کیسے بنا کا نفسیاتی بیان اس افسانے کا کلائمکس ہے:

''بھاگتے بھاگتے تلوے اس کے دکھنے لگے اور چپٹے ہونے لگے اور کمر اس کی درد کرنے لگی پر وہ بھاگتا رہا

اور کمر کا درد بڑھتا گیا۔''۱۱

یہاں الیاسف کا بھاگنا بے سود ثابت ہو رہا ہے کیوں کہ اب دیر ہو چکی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جون کی تبدیلی کا عمل کسی طور رک جائے مگر سماج کے اجتماعی افعال کا نتیجہ اسے بھی بہر حال بھگتنا ہے۔

''وہ دفعتاً جھکا اور بے ساختہ اپنی ہتھیلیاں زمین پر ٹکا دیں۔ الیاسف نے جھک کر ہتھیلیاں زمین پر ٹکا دیں اور بنت الاخضر کو سونگھتا ہوا چاروں ہاتھ پیروں کے بل تیر کے موافق چلا۔''۱۲

انتظار حسین نے الیاسف کے دو گناہ بتائے ہیں ایک یہ وہ سبت والے دن شکار کرنے تو نہ جاتا مگر گڑھا کھود کر اس کو نالی کے ذریعے سمندر سے ملا دیا۔ اور اگلے ن مچھلیاں پکڑ لیں۔ یہ خدا کے ساتھ فریب تھا مکر تھا۔ دوسرا قصور اس کا یہ تھا کہ نصیحت پر اس نے کان نہ دھرے اور لفظ اس کے لیے خالی برتن کی مثال رہ گیا۔ تو گویا لفظ کی موت اانسانیت کی موت ہے۔

سجاد باقر رضوی نے کہا کہ زرد کتا نفس امارہ کے حوالے سے فرد کی روحانی زندگی کے انحطاط کی کہانی ہے۔ (۱۳)

ابوسعید، احمد حجری، سید علی الجزائری، سید رضی، ابومسلم بغدادی، شیخ حمزہ، ابوجعفر شیرازی، حبیب بن یحییٰ ترمذی اور شیخ سعدی کا ذکر ہے۔ ان کے افعال و اقوال سے روحانی طاقت کے سامنے مادی دنیا کی بے ثباتی کو بیان کیا گیا۔ کہانی کا اسلوب ملفوظات کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ کہانی کار نے پس منظر اپنے سماج کا رکھ کر کامیاب افسانہ تخلیق کیا ہے۔

شیخ ابوسعید فاقوں کی وجہ سے بیوی کے کہنے پر باہر گئے اور سوال کیا خیرات لے کر لوٹ رہے تھے کہ کوتوالی والوں نے جیب تراشی کے جرم میں پکڑ لیا اور ہاتھ کاٹ دیا۔ کٹا ہوا ہاتھ گھر لے آئے اسے سامنے رکھ کر رویا کرتے تھے کہ اے ہاتھ تو نے طمع کی اور سوال کیا تو پھر اپنا انجام دیکھا۔

احمد حجری کی حکایت کو ادب کے ساتھ جوڑا ہے۔ جب ہر ایرا غیرا شاعر بن بیٹھا تو شیخ نے شاعری ترک کر کے شراب کا کاروبار شروع کر دیا۔ اچانک ایک دن گدھا شعر پڑھنے لگا تو احمد حجری کی زبان کو تالا لگ گیا۔ جہاں دانش مند چپ اور گدھے کلام کریں تو اس وقت سے پناہ مانگنی چاہیے۔ شیخ علی الجزائری نے انسانوں کو چھوڑ کر اپنا منبر قبرستان میں رکھوا دیا۔ خطبہ دیا تو قبروں سے درود کی صدا بلند ہوئی۔ یہاں جیتے لوگ بہرے ہو گئے اور مردوں کو سماعت مل گئی۔

عالم کی پہچان کیا ہے؟

فرمایا: اس میں طمع نہ ہو

عرض کیا: طمع دنیا کب پیدا ہوتی ہے؟

فرمایا: جب علم گھٹ جائے۔

عرض کیا علم کب گھٹتا ہے؟

فرمایا: جب درویش سوال کرے۔ شاعر غرض رکھے، دیوانہ ہوش مند ہو جائے۔ عالم تاجر بن جائے۔ دانش مند نفع کمائے۔

اس افسانے میں نفس کی خواہشات کو انسانی پستی کا ذمے دار بتایا گیا ہے۔ نفس کی مثال زرد کتے کی سی ہے جو دنیا میں جی لگا کر انسان کو اس کی تخلیق کے مقصد کو سمجھنے سے روکتا ہے۔ انتظار حسین کو قلق ہے کہ اس کی قوم کے جاہل عوام الناس کو درس دے رہے ہیں اور عالم فاضل روزی روٹی کے لیے خوار ہو رہا ہے:

''بزرگ جب سفر سے واپس آئے تو دیکھا سڑک کنارے ایک شخص جس کے چہرے پر علم و دانش کا نور عیاں ہے جوتیاں گانٹھ رہا ہے۔''۱۴

موچی دھوکہ دے کر خود عالم کی مسند سنبھال چکا ہے۔ یہ حکایت انتظار حسین کے اپنے معاشرے پر صادق آتی ہے۔

آصف فرخی نے اس کہانی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ملفوظات کے انداز میں چلنے والی اور واقعیت نگاری کی تمام رسومات کی خلاف ورزی کرنے والی یہ کہانی حکایت کو Transform کر کے ایک زر پرست اور علم دشمن معاشرے کے خلاف Moral Indictanant قائم کرتی ہے۔۱۵

''آگے گئے تو دیکھا کہ ایک بے بصیرت موچی مسائل بیان کر رہا ہے (اکابرین وعمائدین اس کے سامع ہیں)۔''۱۶

علم سے دوری، دانش مندوں سے فاصلہ، دولت سے پیار اور رعورت کی خواہش جیسے عوارض کا بیان بار بار آیا ہے۔ بادشاہ کو وزیر عاقل نے کہا جہاں پناہ آپ کی سلطنت دانش مندوں سے خالی ہے کیوں یہاں ہر روز اتنے عالم و دانا دربار میں آتے ہیں انعامات پاتے ہیں:

''عاقل وزیر پر بت یوں گویا ہوا اے آقائے ولی نعمت گدھوں اور دانش مندوں کی ایک مثال ہے کہ جہاں سب گدھے ہو جائیں وہاں کوئی گدھا نہیں ہوتا اور جہاں سب دانش مند بن جائیں وہاں کوئی دانش مند نہیں رہتا۔''۱۷

کایا کلپ، ایسا افسانہ ہے جس کو کافکا کی کہانی سے ماخوذ یا متاثرہ کہا جاتا ہے۔ اس میں بھی انسان اپنی حیثیت کھو بیٹھتا ہے اور وہ مکھی بن جاتا ہے۔ شہزادی کی محبت اس کی بانہوں کی گرمی اور وصل کے لمحات کے دن کو دیو کے دسترخوان

سے پیٹ پوجا کرتا یوں شہزادہ آزاد بخت رات کو شہزادی کی مکھی اور دن کو دیو کے دستر خوان کی مکھی بن کر رہتا۔ نفسانی خواہشات کا غلام انسانیت کے منصب پر زیادہ عرصہ فائز نہیں رہ سکتا:

''صبح ہونے پر دیو رخصت ہوا تو شہزادی نے تہ خانہ کھولا۔ پر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہاں شہزادہ نہیں ہے اور ایک بڑی سی مکھی بیٹھی ہے وہ دیر تک شش و پنج میں رہی کہ یہ کیا ہوا اور کیسے شہزادہ خود ہی مکھی بن گیا۔ پر اس نے منتر پڑھ کر پھونکا کہ وہ مکھی سے آدمی بن جائے پر اس منتر نے آج کچھ اثر نہ کیا۔''۱۸

پرندوں کے درمیان مباحثہ جاری ہے کہ عورت اور مرد میں سے نیک کون ہے اور بد کون؟ اس پر الّو کا استدلال دانش مندانہ ہے اور اس میں صوفیانہ اور بھگتی کا رنگ جھلکتا ہے۔ مشینوں کا شور رات کی تاریکی اور سناٹے کا دشمن بن چکا ہے۔ جنگل کاٹے جا رہے ہیں۔ عورت اور مرد دونوں بد ذات ہیں۔

انسانوں کی کم عقلی اور عاقبت نا اندیشی پر جیسے صوفی اپدیش دیتا ہے بعینہٖ خیالات الّو کے ہیں:

''بد ذات سا بد ذات، سبز قدم خود ہے، منحوس مجھے بتاتا ہے۔ خود بستیاں اجاڑتا ہے نام میرا بد نام کرتا ہے۔ اس کا یہ طور دیکھ کر جی اپنی سرد ہوا، صحبتوں سے نفور ہوا۔ عزلت نشینی کو شعار کیا۔ دن کی روشنی ہی سے بیزاری ہوگئی کہ اس روشنی میں خواہ مخواہ اس بد ذات کی صورت دیکھنی پڑتی تھی۔ رات کا اندھیرا اور سناٹا جی کو خوش ہوا۔ مگر اس مخلوق نے ایسی کارستانی کی کہ اب راتوں کی پاکیزگی بھی جاتی رہی۔''۱۹

اسی ''طوطے مینا کی کہانی'' میں انسان کی عقل کا ماتم تیتر نے بھی کیا ہے۔ پرندے فطرت کے نمائندے ہیں جاتک کتھاؤں اور پنچ تنتر میں ان سے منسوب کئی کہانیاں اصلاح انسانیت کے لیے بیان ہوئی ہیں اور انتظار حسین نے ان سے استفادہ کرتے ہوئے کہیں بھی بخل سے کام نہیں لیا کیوں کہ پرندہ اگر مثنوی مولانا روم اور حکایات سعدی کے سے مفہوم ہے تو کیا ہی بات ہے:

''ہم کا گامنی سے پوچھنے جا رہے ہیں آدمی کو عقل کب آئے گی..... تیتر نے ایک قہقہہ لگایا آدمی اور عقل سبحان تیری قدرت۔ پھر اس نے پر پھڑ پھڑائے اور اڑ گیا۔ مستقل ہنسا ہوا اور شور مچاتا ہوا۔ آدمی اور عقل سبحان تیری قدرت۔''۲۰

صوفیاء کے ملفوظات میں الہامی کتب کی سی بو باس رچی ہوتی ہے اور استفہامیہ انداز سے عام انسانوں کی فکروں پر دستک دی جاتی ہے۔ (الم ترکیف) کیا تو نے نہیں دیکھا۔ ہم نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ (سورۃ الفیل۔ القرآن) یا عزیر علیہ السلام اور اصحاب کہف سے پوچھتا کہ تم کتنا سوئے؟ اور پھر سوال کرنے والا خود ہی جواب دیتا ہے۔ حضور سرور کونین علیہ السلام کا اپنے اصحاب سے پوچھنا! جانتے ہو جھوٹ بولنے والوں کا انجام؟ یا رسول اللہ

ﷺ، اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ صوفی اپنے مرید مکالمہ کر کے کائنات کے رازوں سے پردہ اٹھاتا ہے۔ انتظار حسین نے اپنے ایک افسانے مشکند میں یہی طور اپنایا ہے۔ مشکند حیران ہوا۔ اس بالک نے میرے سوتے سوتے اتنی پیڑیوں کو جنم دے ڈالا۔ اس نے پھرتی دکھائی یا میں لمبا سویا۔

مہاراج تم لمبے سوئے۔ آخر کتنا۔ ''بس یہ سمجھو کہ جگ بیت گیا۔''

''جگ بیت گیا'' مشکند نے حیران ہو کر کہا۔ ستر میں تر تیا جگ میں سویا تھا۔

اور اب کلجگ ہے۔ کلجگ لگ گیا؟ مشکند ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔

خیمے سے دور مجموعہ میں شامل کہانیاں ''حصار'' پورا گیان، برہمن بکرا اور اجنبی پرندے تصوف کا اثر لیے ہوئے ہیں۔ دنیا داری اور روحانیت میں فرق کرنا اس لیے ضروری ہے کہ انسان مقصد تخلیق کو بھولنے نہ پائے۔ یہ دنیا عارضی ہے۔ اس میں جی لگانا خود آدمی کے لیے مہلک ہے۔ حصار میں سالک بننے کے مراحل بتائے گئے ہیں۔ وظیفہ اگر مکمل نہ ہو تو پیر کامل تو درکنار آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔ نئی نسل کے لیے صوفی ازم سے آشنائی بھی ہمیں انتظار حسین کرواتے ہین:

> ''اوپر کے کمرے میں دن دن بھر جانماز پہ بیٹھے رہنا۔ نہ ہنسنا، نہ بولنا، خیالوں میں گم کھڑاؤں پہنے گھڑی دو گھڑی کے لیے باہر آنا اور ابلی دال روٹی کھانا۔ ترک حیوانات کے باعث گوشت، گھی، دودھ سے پرہیز تھا۔ پھر اندر جا کر دروازہ بند کر لینا۔''۲۱

چڑیاں، بچے، قرآن ان تینوں کے ملاپ سے اجنبی پرندے'' کہانی کا تانا بانا بنا گیا ہے۔ بظاہر عام سی کہانی ہے مگر غور کرنے پر اپنے مفاہیم کے خزانے وا کرتی ہے۔ ٹاٹ کے لمبے بوریے پر رحلیں جمائے سیپارے کھولے لڑکیوں کی ایک قطار لگی ہوتی ہے۔ والتین والزیتون والطّور سینا وھذا البلد الامین (قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی اور کوہ طور کی اور اس شہر (مکہ) کی جو امانت دار ہے۔) اس افسانے میں ان تین چیزوں کے اندراج کی وجہ یا تو تہذیبی شعور والا ناقد دے سکتا ہے یا صوفی۔

برہمن بکرا میں جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ کا مضمون مذکور ہے مگر کہانی کا اسلوب ملفوظات سے مملو ہے۔ برہمن نے بیٹا پیدا ہونے کی منت مانی اور اس کے لیے ایک بکرا خریدا۔ بکرے کو ہنستا دیکھ کر برہمن چکرایا:

> ''بکرا بولا۔ اے برہمن! میں دنوں کے ہیر پھیر کو دھیان میں لا کے ہنسا۔ کیا سمے کا چکر ہے اور کیا دنوں کا الٹ پھیر ہے کہ تب تو بکرا تھا اور میں برہمن تھا۔ اب میں بکرا ہوں اور تو برہمن ہے۔''۲۲

پلیٹ فارم افسانہ دونوں ملکوں کے مابین سفری سہولتوں کے فقدان کا بیان لیے ہوئے ہے۔ مگر اس میں بھی

افسانے کا ایک کردار صوفی کے منصب پر فائز نظر آئے تو یہ مان لینے میں کوئی حرج نہیں کہ افسانہ نگار کو سلوک میں درک حاصل تھا:

''جناب ٹرین کے متعلق کوئی اطلاع ؟ ابھی تک کوئی اطلاع نہیں ہے۔

آپ کو کچھ اندازہ تو ہوگا کہ ٹرین کب چلی گی؟ جب حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ حالات کب ٹھیک ہوں گے؟ کیا کہا جاسکتا ہے۔ حالات جب بگڑ جائیں تو جلدی ٹھیک نہیں ہوا کرتے۔ بلکہ پھر ٹھیک ہوا ہی نہیں کرتے.....کیا مطلب؟ یہ کوئی کلیہ ہے؟ کلیہ تو نہیں مشاہدہ ہے۔''۲۳

معاصر صورت حال پر اور آنے والے زمانے میں افسانوں کی معنویت زیادہ Relevant نظر آتی ہے۔

مجموعہ کنکری میں ایسی کہانیاں موجود ہیں جو آسانی سے ملفوظات سے مشابہ قرار دی جاسکتی ہیں مثلاً کنکری اور مایا:

''مولوی صاحب سے بڑی عجلت میں تعویز لکھوایا گیا۔ سلیمہ آپا نے فوراً تعویز سیا اور طاہر کے بازو میں باندھ دیا۔ چند دن تک انھیں طاہر کی طرف سے سخت فکر رہی اور ذرا ذرا سی بات پر شک کیا مگر رفتہ رفتہ تعویز اور صدق نے اپنا اثر دکھایا''۲۴

سلیمہ آپا بیٹے کی نوکری کے لیے پریشان ہیں۔ وظیفے پڑھتی ہیں۔ ورد کرتی ہیں۔ صدقے دیتی ہیں مگر انھیں ایک آواز آتی ہے جو مادیت کے خلاف قلندرانہ نعرہ ہے۔ چھن چھن چھن۔ دولت لے لے، بیٹا دے دے، دولت لے لے، بیٹا دے دے۔

انتظار حسین کے اوّلین مجموعہ ''گلی کوچے'' میں ایک رپورتاژ سانجھ بھئی چوندیس کے نام سے شامل ہے۔ یہ عنوان امیر خسرو کے ایک دوہے سے مستعار ہے:

گوری سوے سیج پر مکھ پہ ڈارو کیس
چل خسرو گھر آ اپنے سانجھ بھئی چندیس

اس دوہے کی وجہ نزول یہ ہے:

''امیر خسرو نے دلی میں آ کے اپنے مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کی وفات کی خبر سنی تو انھوں نے یہ دوہا کہا اور بے ہوش ہو گئے اور ایسے بے ہوش ہوئے کہ پھر ہوش میں نہ آئے۔''۲۵

مزارات (مرزا غالب، نظام الدین اولیاء، امیر خسرو) ان پر فاتحہ پڑھتے معتقدین اور امام حسینؓ کے مدینہ چھوڑنے کے منظر کا بیان پورے افسانے کو صوفیانہ بنائے ہوئے ہے۔

شہرافسوس میں شامل کہانیاں شہرافسوس، وہ جو کھوئے گئے، شرم الحرم اور وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے بھی صوفیوں کے اقوال وافعال کے توسل سے سمجھے جائیں تو پورے معانی کھولتے ہیں۔ شہرزاد کے نام کے بیش تر افسانے ملفوظات سے اپنا ناطہ جوڑتے نظر آتے ہیں۔ کلیلہ دمنہ کی کہانیاں (جو کہ چار ہیں) چوہیا نے کیا کھویا کیا پایا اور جبالا کا پوت زیادہ اہم ہیں۔ جبالا کا پوت جنگل میں مظاہر فطرت سے جو سبق لیتا ہے وہ سلوک کی راہوں پر گامزن لگتا ہے۔ اس مجموعے کی آخری کہانی ''میرے اور کہانی کے بیچ'' ہے۔ اس میں افسانہ نگار ۲۸۔مئی ۱۹۹۸ء کے پاکستانی ایٹمی دھماکوں پر ردعمل دیتے ہیں (یاد رہے اسی مجموعہ میں مورنامہ میں وہ بھارتی دھماکوں پر اپنا بیانیہ دے چکے ہیں)۔ جنگ سے نفور، تخریب سے لاتعلقی، انسانیت سے پیار صوفیانہ مسلک ہے۔ زاہدہ حنا نے کسی زمانے میں قراۃ العین حیدر کو فکشن کی رابعہ بصری کہا تھا (بحوالہ ''دامان باغبان'' مس حیدر) دل چاہتا ہے انتظار حسین کو فکشن کا فریدالدین عطّار لکھوں۔ دھماکوں سے چاغی کا پہاڑ مشکل میں ہے۔ افسانہ نگار افسانہ لکھنا بھول چکا ہے اور پہاڑ کی مشکل کو آسانی میں بدلنے کی دعا کر رہا ہے۔

> ''شاید اس وقت پاکستان کے ایک پہاڑ پر ایسی ہی آزمائش کی گھڑی آئی ہوئی تھی۔ اس بھاری وقت میں اس پہاڑ نے کمال ہمت سے کام لیا کہ وہ دھماکہ جو تباہی اپنے جلو میں لے کر آیا تھا اس سب کو اس نے اپنی جان پر لے لیا اور پاکستان کے جانداروں کو گزند نہیں پہنچنے دیا۔ اس عالم میں کس اذیت سے گزرنا پڑا اس کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ یہ اذیت جھیلتے ہوئے وہ پہاڑ لرز اٹھا اور اس کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اب اس کا اپنا قدرتی رنگ کبھی واپس نہیں آئے گا۔''۲۶

قصے، حکایتیں، تمثیلیں، کتھائیں بس ہند اسلامی روایت کی طاقت رہی ہیں۔ ان میں صوفی، دانشور، بھگت اور حکیموں ویدوں کے اقوال وتعلیمات کا خزانہ بھرا ہوا ہے۔ انتظار حسین نے اپنے فن کو اس روایت سے خوب سے خوب تر بنایا۔ نئی پرانی کہانیاں کے دیباچے میں رقم طراز ہیں:

> ''یا الٰہی یہ ہماری کہانیوں کی روایت ہے یا اتھاہ کتھا ساگر ہے۔ دو بڑے دھاروں کا سنگم۔ ایک دھارا قصوں، حکایتوں داستانوں کا جو عرب وعجم سے بہتا چلا آ رہا ہے۔ دوسرا کتھا، کہانیوں، جاتکوں کا جو قدیم ہند کے بھید بھرے سوتوں سے پھوٹا۔''۲۷

اس اعتراف کے بعد صوفی اور بھگتی اثرات کو انتظار حسین کے فن پاروں میں تلاش کرنا اور بھی سہل ہو جاتا ہے۔ فقط چند افسانوں کو ملفوظات صوفیا سے متعلق قرار دینا قرین انصاف نہیں۔

حوالہ جات

۱۔ غلام حیدر سندھی۔ حیات لال شہباز قلندر۔ قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت سنٹر آف ایکسی لینس، قائد اعظم یونی ورسٹی، اسلام آباد۔ ۲۰۰۶ء۔ ص ۵۵

۲۔ انتظار حسین۔ تذکرہ۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ ۱۹۸۷ء ص ۱۸۷

۳۔ جمیلہ ہاشمی۔ دشت سوس۔ فروز سنز، لاہور۔ ۱۹۸۸ء۔ ص ۴۸۴

۴۔ فتح محمد ملک۔ تردید و تحقیق۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ ۱۹۹۵ء۔ ص ۲۶۸

۵۔ سید عثمان بن علی۔ ترجمہ مفتی غلام معین الدین نعیمی۔ کشف المحجوب۔ سروسز بک کلب، لاہور۔ ۲۰۱۴ء۔ ص ۵۴

۶۔ انتظار حسین۔ آگے سمندر ہے۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ ص ۱۰

۷۔ محمد حسین آزاد۔ دربار اکبری۔ نگارشات، لاہور۔ ۱۹۹۸ء۔ ص ۷۷

۸۔ ابو حامد محمد العزالی۔ ترجمہ محمد سعید الرحمٰن علوی۔ نسخہ کیمیا، کیمیائے سعادت۔ مکتبہ رحمانیہ، لاہور۔ ۱۹۸۰ء۔ ص ۳۳۹

۹۔ ایضاً۔ ص ۸۳۱

۱۰۔ انتظار حسین۔ چراغوں کا دھواں۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ ۲۰۰۷ء۔ ص ۹۷

۱۱۔ انتظار حسین۔ آخری آدمی۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ ۲۰۰۷ء۔ ص ۲۶

۱۲۔ ایضاً۔ ص ۲۶

۱۳۔ ایضاً۔ ص ۱۳

۱۴۔ ایضاً۔ ص ۳۳

۱۵۔ آصف فرخی، ڈاکٹر۔ چراغ شب افسانہ۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ ۲۰۱۶ء۔ ص ۸۲

۱۶۔ انتظار حسین۔ آخری آدمی۔ ص ۳۳

۱۷۔ ایضاً۔ ص ۳۲

۱۸۔ ایضاً۔ ص ۹۴

۱۹۔ انتظار حسین۔ خالی پنجرہ۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ ۲۰۰۸ء۔ ص ۹۶

۲۰۔ انتظار حسین۔ خالی پنجرہ۔ ص ۹۸

۲۱۔ انتظار حسین۔ خیمے سے دور۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ ۲۰۱۲ء۔ ص ۳۱

۲۲۔ انتظار حسین۔ خیمے سے دور۔ ص ۹۳

۲۳۔ انتظار حسین۔ خیمے سے دور۔ ص ۱۳۱